پاکستانی اُردو افسانے میں نظریہ صارفیت

سنبل نسیم

Abstract:

Modern sociological studies suggest that during the capitalistic era of social evolution through the requirements of trade mechanism, human beings at every step of their lives, are facing new needs. These mechanically created new needs have been bringing forth commercial societies everywhere in the World. In Urdu literature, especially in the fiction fields, readers are coming across new kind of social and cultural scenarios based on entirely new commercial setups. The writer of this article points out that contemporary materialistic needs have been forcing too the Urdu short story writers to depict in their stories new kind of aptitudes coming out of prevalent consumerist systems.

انسانی زندگی میں ضرورتوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔کئی ضرورتیں زندگی کی بقا کے انتہائی ضروری ہیں ۔ان میں آکسیجن، پانی، غذا وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سی ضرورتیں ایسی ہیں کہ جو انسانی سماجی اور تہذیبی ترقی کی بدولت اس کا جزو بن گئی ہیں ان میں رہائش ،لباس ،آرائش ،سواری،وغیرہ شامل ہیں۔عہد حاضر میں صنعتی اور تکنیکی اشیا کی بہتات اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انسان نے ضرورت اور احتیاج کی انتہائی بنیادوں کے ساتھ ساتھ دیگر کئی نئی سماجی اور تہذیبی ضرورتوں کو قبول کرتے ہوئے زندگی میں تنوع اور رنگا رنگی کو فروغ دیا ہے۔بیسویں صدی کے انسان نے اس قدر اشیا پرستی کی ہے کہ آج اسے صارف حیوان کے طور پر بھی دیکھا جا رہا ہے۔صارفیت کی اصطلاح عہد حاضر کے معاشی نظام کو سمجھنے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔

بشریاتی مطالعے جہاں اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اوائلی انسان کو جہاں اپنی بنیادی ضرورتوں کو احسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں وہاں ہمارے زمانے کے انسان نے تجارتی بنیادوں پر نئی ضرورتیں پیدا کرنے کا بندوبست بھی کیا ہے۔آج انسانی زندگی میں پرانی بشریاتی قدریں رنگا رنگی کے

لبادے اوڑھے سامنے آ رہی ہیں۔موجودہ عہد کے صارف معاشرے مصنوعی ضرورتیں پیدا کرتے ہوئے انسان کو ان کا خریدار بننے کی ترغیب دیتے چلے جا رہے ہیں۔یوں کمر شالزم اپنے عروج کو چھو چکی ہے۔نئے تجارتی لین دین کی بنیادی منطق انسان کو اشیا پرستی کی جانب مائل کر چکی ہے۔صارفیت نے ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے تصور کو بدل دیا ہے اب آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ایجادات اور نئی نئی اشیا کی پیداوار نے ضرورتوں کو جنم دینا شروع کیا ہے۔

اُردو افسانہ نگاروں نے بھی وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلے ہوئے ماحول کی عکاسی کرنے کا ہنر سیکھا ہے۔اُردو افسانے میں پریم چند سے لے کر سمیع آہوجہ تک کئی افسانہ نگاروں نے عصری صورت حال کی روشنی میں نئے انسانی رویوں اور مختلف نظریات کو خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

نظریہ یا آئیڈیالوجی کا لفظ وسیع ترین معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔نظریہ زندگی کی دین ہے۔یہ کسی ادیب یا مفکر کے زندگی سے اخذ کردہ خیالات کا مجموعہ ہے۔افسانہ نگار کا نظریہ محض اس کے خیالات کا مجموعہ نہیں ہوتا، اس میں اس کا احساس بھی موجودہ ہوتا ہے۔افسانے کے اجزا میں نقطہ نظر کی بنیادی اہمیت ہے۔افسانہ نگار زندگی سے اخذ کردہ اپنے نظریات کو مختلف کرداروں اور رنگا رنگ کہانیوں کی صورت میں پیش کرنے پر قادر ہوتا ہے۔شاعری، ڈرامے، رزمیے ۔ المیے ، طربیے وغیرہ کے سلسلے میں ارسطو کے نظریات اپنے استاد افلاطون کے نظریات سے مختلف تھے۔یہ نظریاتی اختلاف بعد کے ادب میں بدستور موجود رہا۔پاکستانی اردو افسانے میں ترقی پسندی، رومانویت، حقیقت نگاری، وجودیت وغیرہ کے حوالوں سے نظریاتی کشمکش کے سلسلے اپنے رنگ دکھا رہے ہیں۔افسانہ چاہے واقعے کا اظہار کرے، کردار کا یا دونوں چیزوں کا، سماجی حقیقت کو بیاں کرے یا نفسیاتی نکات کی گہرائیاں کریدے، کسی نہ کسی مقصد کا امین ہوا کرتا ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی ضروری نہیں کہ مقصدیت کسی ادیب کے شعور کا حصہ ہی ہو بلکہ بعض اوقات ادیب یا فنکار لاشعوری طور پر بھی کسی نہ کسی مقصد کی تکمیل کر رہے ہوتے ہیں:

> "تاریخ ادب بتاتی ہے کے اگرچہ ادب کو کسی مقصد کے تابع رکھنے کا نظریہ اپنی نہایت لچکیلی اور غیر اذیت ناک صورت میں کافی دیر تک بالادستی کا حامل رہا۔ تاہم آہستہ آہستہ اس نظریہ میں ایک ایسی سنگینی اور ایذا رسانی در آئی کہ انیسویں صدی میں اس کے خلاف ایک شدید ردعمل رونما ہوا۔اس نظریہ نے کبھی ادیب کے سامنے "مذہب و اخلاق " کو بطور " حکم" پیش کیا، اور کبھی "ریاست و ملت " کو "بت" کا درجہ دے کر ادب کو اُنکی پرستش پر آمادہ کیا" (۱)

افسانہ ادب کی ایسی صنف ہے جس میں زندگی کے کسی ایک گوشے ، تاثر، کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے۔اُردو افسانہ اپنے آغاز ہی سے دو واضح نظریات میں تقسیم ہو گیا تھا۔ایک نظریہ رومانوی تھا اور دوسرا ترقی پسند۔رومانوی افسانہ نگاروں نے اپنے اردگرد موجود صارفیت کی پرچھائیاں رکھنے والے ماحول کو اپنے بیانیوں میں جگہ دی۔ترقی پسندوں

نے نو آبادیاتی نظام کے جبر اور صارفانہ منظر ناموں کو اپنے غیر طبقاتی نظریات کی کسوٹی پر پرکھا۔ان کے افسانوں میں ظالم سے نفرت کا نظریہ پروان چڑھا۔ صارفیتی معاشرے میں مفلسی، بے بسی، بے چارگی، مجبوری، دنیا سے اور پھر اپنی ذات سے بیزاری جیسی جن کیفیات نے جنم لیا تھا اس کے حوالے سے سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ کے افسانے اہمیت رکھتے ہیں۔ ۔مشرق کے زوال آمادہ جاگیرداری نظام اور مغرب میں صنعتی انقلاب کے ٹکراؤ نے لوگوں میں جس مغائرت کو پروان چڑھایا اس پر انور سجاد اور خالدہ حسین کے افسانے بطور خاص ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اُردو افسانہ میں مختلف نظریاتی رویوں اور مباحث کو عمدہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔سوشل ازم کے تصورت نے امپریل ازم کی پیدا کردہ کاروباری اور تجارتی صورت حال کو رد کیا۔ جمالیاتی ادبی حوالوں میں ماحول کے بیانیوں نے اسٹیٹس اور وی آئی پی زندگی کی صورت حال کی عکاسی کی۔اس حوالے سے رضیہ بٹ، اے آر خاتوں اور ڈائجسٹوں میں افسانے چھپوانے والے افسانہ نگاروں نے موثر کہانیاں لکھیں۔ علاوہ ازیں تجریدیت، نفسیات اور سرئیلزم کے حوالے سے بھی کئی افسانے لکھے گئے۔رشید امجد، مظہر الاسلام، سمیع آہوجہ کے کئی افسانے اس سلسلے کے عکاس ہیں۔انہوں نے گلوبلائزیشن اور اس سے متعلقہ چند دیگر مباحث کو بھی اپنے افسانوں کا حصہ بنایا۔قریباً تمام پاکستانی افسانہ نگاروں نے کسی نہ کسی رنگ میں صارفیت کے نظریات کے تابع وجود میں آنے والے ماحول اور کرداروں کی صورت حال کو پیش کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

''صارفیت''(Consumerism)اصل میں اقتصادیات سے متعلق اصطلاح ہے۔ صارفیت کے نظریے کے حامل افراد اس بات پر یقین رکھتے کہ انسان کی فلاح و بہبود اور اس کی خوشی اور تسکین کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ کس حد تک اشیاء کو بڑے پیمانے پر صرف کر سکتا ہے۔ خاص طور پر وہ مادی اشیا کو کس مقدار میں خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔فلاح و بہبود کا تصور صرف اور صرف افراد کے معیارِ زندگی پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ فرد کی تسکین کا مرکز یہ ہے کہ وہ کتنی مقدار میں اشیائے خورد و نوش کو استعمال کر سکتا ہے۔خرید سکتا ہے، اور اس کو اپنی ملکیت میں رکھ سکتا ہے۔

ایک کنزیومرسٹ یا صارف سوسائٹی کے اندر رہنے والے تمام افراد اپنا زیادہ تر وقت وسائل اور توانائی، اشیا کو صرف کرنے میں گزارتے ہیں۔اس سوسائٹی میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اشیا پرستی اچھا تصور ہے۔

صارفیت ایک معاشرتی اور اقتصادی نظریہ ہے۔جس کا تعلق اشیاء اور خدمات (Services) کے حصول سے ہے۔صارفیت کے نظریے کو دانشوروں نے اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔صارف سوسائٹی صارفین کو اشتہارات کے ذریعے نئی پیداواروں سے یوں آگاہی بخشتی ہے کہ اندر ان کے حصول کی تمنائیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

"Consumerism" is the concept that consumers should be informed decision makers in the marketplace. Practices such as product testing make

consumers informed. (2)

"Consumerism" is the concept that the marketplace itself is responsible for ensuring social justice through fair economic practices. (3)

"Consumerism" refers to the field of studying, regulating, or interacting with the marketplac." (4)

اسی حوالے سے دنیا بھر میں صارفین کے حقوق کی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔امریکہ اس تناظر میں ایک بہترین مثال ہے جو کہ دنیا میں سے زیادہ کنز یومرسٹ سوسائٹی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت صارف کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے صارفوں کے حقوق کی تکمیل سے سروکار نہیں رکھا بلکہ انہوں نے صارفیت کے زیر اثر پروان چڑھنے والے مادی رویوں کی انسان دشمنی کو نمایاں کیا ہے۔اس حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''گھر سے گر تک'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

میڈیا نے نشر و اشاعت کے ذریعے صارفین کے اندر اس بات کا یقین پیدا کر دیا ہے کہ ان اشیا کا استعمال جو وہ اشتہارات کے ذریعے دکھاہے ہیں ان کی زندگیوں کو نہ صرف بہتر اور زیادہ آسان بنانے کے لیے لازمی ہے اور یہ کہ ان کے استعمال سے ان کو ذہنی و جسمانی تسکین بھی میسر آسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اشیا کو خرید کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات وہ اپنی بنیادی ضروریات سے بڑھ کر دیگر اشیا کو خریدنے کے لیے ادھار کا سہارا بھی لیتے ہیں۔مثال کے طور پر بڑا گھر خریدنے اور نئے یا پرانے ماڈل کی موٹر کار خریدنے کی خواہش یا اچھا اور بڑا ٹیلی وژن خریدنے کی خواہش۔ یہ اس سماج کی وہ تمام خصوصیات ہیں جس میں '' صارفیت'' زندگی کا بنیادی جزو قرار دیا جاتا ہے۔'' صارفیت'' کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یو۔ایس سینسز بیورو کے ایک سروے نے (U.S CENSUS BUREAU) ۱۹۶۰ء سے ۲۰۰۷ء تک کے عرصے میں نئے بڑے گھروں کے بڑھتے ہوئے رجحان کا اندازہ لگایا۔ 1980ء کی دہائی کے دوران پچیس فیصد گھروں کا رقبہ ۱۲۰۰ فٹ سے کم اور پندرہ فیصد گھروں کا رقبہ ۲۵۰۰ فٹ سے زیادہ تھا۔لیکن ۲۰۰۷ء کے آخر تک آتے آتے صورتحال کچھ اس طرح بدلی کہ تین فیصد سے بھی کم گھر ۲۵۰۰ فٹ سے بھی کم تھے۔ اور چالیس فیصد گھر ۲۵۰۰ سے بھی زیادہ تھے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ اس عرصے کے دوران اوسطاً ایک کنبے میں افراد کی تعداد کم ہوگئی ہے۔اور افراد کی جگہ ان اشیا نے لینی شروع کر دی جو ہماری بنیادی ضروریات کے دائرے سے باہر ہیں جیسے کہ بڑے ٹیلی وژن، ہوم تھیٹرز، آلات ورزش، بڑے باورچی خانے بڑی اور زیادہ کاروں کے لیے گھروں میں گنجائش وغیرہ وغیرہ مذکورہ بالا تمام حوالے صارفیت کے نظریے کی شدت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس انداز اور جس رفتار سے صارفیت کا نظریہ ہمارے معاشرے میں پروان چڑھ رہا ہے وہ ہمارے مشترکہ خاندانی نظام کو تبدیل کر کے انفرادی خاندانی نظام کی طرف لے کر جا رہا ہے۔جیسا کہ مغرب میں ہو چکا ہے۔ کیونکہ صارفیت کا نظریہ برق رفتاری سے افراد کی نفسیات کو متاثر کر کے تبدیل کر رہا ہے جس کی وجہ سے ایک نیا معاشرہ یا کلچر پنپ رہا

ہے۔ کسی معاشرے مین روابط وسلوک ، عادات و خصائل ، اخلاقیات طرز بودو باش، رسم ورواج ،حسن و جمال ،فن و اظہارفن کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہی اس معاشرے کے سماجی ااقدار کہلاتے ہیں۔ یہ کسی اقدار کسی خاص مشاورتی مجلس مین وضع کردہ نہیں ہوتیں۔اور نہ ہی ان کو نافذ کرنے کے لیے کوئی قانون بنایا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات ہوتی ہیں۔ معاشرے کی جدو جہد پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کے تجربے اور مشاہدے ہوتے ہیں۔ جمالیاتی ذوق ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں مل کر کسی بھی سماج کی اقدار وضع کرتے ہیں کسی معاشرے کو اپنی اقدار وضع کرنے اور ان اقدار کے مطابق زندگی گزارنے میں بڑے مدت درکار ہوتی ہے۔صارفیت نے آج ہماری سماجی قدروں کو تبدیل کر دیا ہے۔صارفیت کے اسی نظریے نے گلو بلایزیشن کے نظریے کو جنم دیا ۔اور اس سے بڑے کر مغربی ممالک کے درمیان آزاد تجارت کو فروغ دیا۔

گلوبلائزیشن ایک ایسا عمل ہے جو بین الاقوامی سطح پر ، اشیاء نظریات ، اور ثقافت کا باہمی ملاپ ہے۔ گلوبلائزیشن کے لیے اردو میں عالمگیریت کا لفظ مستعمل ہے۔ عالمگیر کو پہلے ہم Universal کے لیے استعمال کرتے تھے اب گلوبلائزیشن کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ہم نے یہ بات اکثر سنی ہوگی کہ یہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح ایک گاؤں میں تمام افراد کو ایک دوسرے کی خبر ہوتی ہے۔ اب دنیا میں ذرائع ابلاغ اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ پوری دنیا کا ایک دوسرے سے رابطہ قائم ہو گیا ہے اور ایک دوسرے کے قریب آ گئی ہے۔مختصراً یہ کہ دنیا سکڑ گئی ہے۔

اقتصادیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو پہلے جو کمپنی تھی وہ صرف ایک ملک کے لیے سامان بناتی تھی اب وہ کمپنی ملٹی نیشنل ہوگئی ہے۔ اقتصادات گلوبل ہوگئی ہیں۔ یہاں تک کہ اقتصادیات اشتہار بازی کے ساتھ بندھ گئی ہے۔ دنیا ایک دوسرے کے قریب آ گئی ہے۔

دنیا کے ایک دوسرے کے قریب آنے کی وجہ سے ٹیکنالوجی ترقی بھی کر رہی ہے اور ایک سے دوسری جگہ منتقل بھی ہو رہی ہے۔خبریں، ادب، ثقافت ایک جگہ سے دوسرے جگہ منتقل ہونے سے ہمارے شہروں کا نقشہ بھی ایک دوسرے سے مماثل ہوتا جارہا ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ علم اور معلومات کے لحاظ سے ہوا ہے۔ کرہ ارض پر جہاں بھی جو کچھ ہوتا ہے ہمیں گھر بیٹھے اس کی خبر ہو جاتی ہے۔ نہ صرف معلوم ہو جاتا ہے بلکہ ہم گھر بیٹھے دیکھ بھی لیتے ہیں۔ گویا ہر واقعہ ہمارے قریب کا واقعہ اور ہر منظر ہمارے قریب کا منظر ہو گیا ہے۔ دنیا وقت کے ساتھ ساتھ بدل رہی ہے۔ اور اس بدلتی دنیا کو ہم دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک میں جو جو کچھ ہو رہا ہے ہمیں سب خبر ہے۔

ادبی تخلیق کار یہاں خاص طور پر افسانہ نگار کے بارے میں بات ہوگی تو معلوم ہوگا کہ افسانہ نگار انہی حالات میں زندگی گزار رہے وہ ان کی روشنی میں عمل کرتے انسان کو اپنی فکر کا موضوع بنا رہے ہیں۔ پہلے افسانہ نگار قارئین کو اپنی تحریروں کے ذریعے بتاتا تھا کہ دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔لیکن اب اس کے کام کی نوعیت بدل گئی ہے اب اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے بتائے کہ مذکورہ بالا حالات کی وجہ سے فرد کا ذہن اور زندگی

کیونکر متاثر ہو رہے ہیں اوران حالات سے دوچار ہو کر وہ کس ذہنی ، جذباتی اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی آج کے افسانہ نگار کی فکر کا خاص محور ہیں۔

بھارت کے افسانہ نگار نیّر مسعود نے اپنے مضمون میں نئے افسانہ نگار کے چند موضوعات کی نشاندہی کی ہے جن کو من وعن نقل کیا جا رہا ہے۔

(الف) ''گھر کا ایک فرد کسی خلیجی ملک میں ملازمت کرنے لگتا ہے۔ ابھی تک یہ گھر پس ماندہ اور مفلوک الحال تھا، لیکن اب یہاں خلیج سے بڑی بڑی رقمیں اور عیش و آسائش کے سامان آنا شروع ہوتے ہیں۔ کمانے والے کی لمبی جدائی گھر والوں کو بالکل شاق نہیں، ان کو زیادہ فکر اس کی ہے کہ دوسرے گھرانوں کے مقابلے میں ان کی مالی حیثیت جتنی اونچی ہوئی ہے، سماجی حیثیت بھی اتنی ہی اونچی ہو جائے۔

(ب) مغرب میں جا بسنے والے ہندوستانی وہاں اپنا تشخص قائم رکھنے کی جدو جہد کرتے ہیں۔ اور ایک برادری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہاں دل بھی لگا لیتے ہیں۔ اور اپنے وطن اور اس ماحول کو بھول بھی نہیں پاتے ۔ جس میں انہوں نے پرورش پائی ہے۔ چھٹی لے لے کر وطن آتے ہیں۔ ان کی اولاد جس نے مغرب میں پرورش پائی ہے۔ یہاں کے ماحول اور پس ماندگی سے وحشت کھاتی ہے۔ وہ خود بھی یہاں سکون نہیں پاتے اور بے حاصلی کے احساس کے ساتھ لوٹ جاتے ہیں۔ اور وہاں اپنی اولاد کو مغرب کے رنگ میں رنگتے دیکھتے رہتے ہیں۔

(ج) معمولی مالی حیثیت کے لوگ اپنے بچوں کو جدید طرز کے اچھے سکولوں میں پڑھوانے کی استطاعت نہیں رکھتے مگر پڑھواتے ہیں اور زیرِ بار ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ تعلیم ان کے بچوں کو اپنی روایت سے بیگانہ کر رہی ہے، مگر پڑھوانے پر مجبور ہیں۔ پڑھوانے ہی پر نہیں ، اس تعلیم سے خوش ہونے پر بھی مجبور ہیں۔

(د) خانوادگی نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ رشتون کی وہ حیثیت نہیں رہی جو پہلے تھی۔

(ہ) بزرگوں کو تبرک سمجھنے کے بجائے بار سمجھا جانے لگا ہے اور ان کی قائم کی ہوئی روایت کو نئی نسل نباہنا نہیں چاہتی۔ نباہ نہیں سکتی وغیرہ۔(۵)

''اس بے شباہت دور کی منافقت نے چیزوں کو اس طرح بے توقیر اور بے حرمت کر

دیا ہے کہ تنہائی جس کی کوکھ سے کبھی کشف گیان اور عظمت کے چشمے پھوٹتے تھے اب ہولناک سناٹے کا روپ دھار چکی ہے کہ تنہائی میں سے ایک کرب ناک مسخ چہرے والی بے خواب ویرانی نے جنم لیا ہے جس کا تصور آتے ہی اور اذیت جسموں پر دستک دینے لگتی ہے۔'' (۶)

رشید امجد کے یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''سب کے منہ پر پلاسٹر ٹیپ لگے ہوئے کپڑے ان کا گوشت کھا گئے ہیں، مگر ٹیپ اسی طرح ہیں۔'' (۷)

''اُنہوں نے اپنی بیجوں کو منافقت کے پانی سے سینچا تھا اُن کے کھیتوں میں فصل کی جگہ دیواریں اُگیں۔'' (۸)

''پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا کہ کچھ لوگ کھلیانوں اور کارخانوں میں بھوک بانٹتے پھر رہے ہیں، کسان اور مزدور اپنے کاسوں میں بھوک کی بھیک لے کر ایک دوسرے کے گریبان پکڑ رہے ہیں اور بھوک بانٹنے والے دوہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس دن چبوترے پر چڑھ کر اس نے چیخ کر کہا، حق داروں کو اُن کا حق دو، ورنہ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔'' (۹)

سمیع آہوجہ لکھتے ہیں:

''اس کے لیے تو اپنے دست و پانہ ہلانا انتہائی فر وماندگی سارا فشار ہماری ذمے داری، سرکار، دربار اور سارے اہل کار لوٹ کھسوٹ میں لگن۔

ان کو نیست و بابود کرنے کے لیے اسلحہ لازم

اور اسلحہ؟

آج کے دور میں چپے چپے پر بکھرا پڑا ہے، اس کے لیے پیسہ اور پلاننگ چاہیے اور کہ سب کچھ اب میری ذمے داری۔۱۰

صارفیت کے نظریے نے اُردو افسانے کو ایک نئی روش پر چلنا سکھایا۔ آج کا افسانہ نگار نظریاتی حوالے سے آزاد ہے اور ہر قسم کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر لکھنے کا قائل ہے۔ جہاں صارف ہو گا وہاں کاروبار ہو گا اور جہاں کاروبار ہو گا وہاں فرمز کھچی چلی آئیں گی۔ صارفیت کے نظریے کے حامی افراد مارکیٹ اکانومی کی بات کریں گے کہ جس چیز کا صارف موجود ہے اُسے بیچا جائے اور منافع کمایا جائے۔ اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کے وہ چیز معاشرے کے

لیے عمومی طور پر مفید ہے یا نہیں۔

ادب عصری حقیقتوں سے اپنا نظری لباس تیار کرتا ہے۔ادیب کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کی خارجی صورت سے با خبر رہے۔صارف انسان اور صارفیت زدہ سماج نے ادیب کے خیالات کو نئی جہتیں عطا کی ہیں۔ نئے پاکستانی افسانہ نگاروں نے بھوک، طمع، بے بسی، مغائرت، نمائش، آبرو باختگی، ناداری، غلامی، اسٹیٹس زدگی، حرام خوری، نفع، ضرر، رشوت، کرپشن، جسم مزدوری، ظلم، استحصال، جنگ، ملکوں اور زمینوں پر ناجائز قبضے اور اسی نوع کے دیگر موضوعات کو صارف معاشروں کے پس منظر میں نئی معنویت کے ساتھ اجاگر کرنے کا ہنر سیکھ رکھا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) عارف عبدالمتین، امکانات، ٹیکنیکل پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص: ۸۳

(2) Swagler, Roger (1997). ***Modern Consumerism***. In Brobeck, Stephen. Encyclopedia of the Consumer Movement. Santa Barbara, Calif.: ABC-Clio. pp. 172–173

(3) Rechel-E-Dwyer, **Expanding Homes Increasing in Equaliteis**: U.S ***Housing Development and the Resideclal Segregation of the Affluent***, Social Problems, Vol. 54, No. 1 (February 2007), Oxford University Press: PP 23-46.

(4) ibid

(۵) ایضاً

(۶) نیر مسعود، افسانے کی تلاش، کراچی، شہرزاد، ۲۰۱۱ء، ص: ۶۵۔

(۷) رشید امجد، پت جھڑ میں خود کلامی، سہ پہر کی خزاں، راولپنڈی، دستاویز، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۵۔۲۸۔

(۸) رشید امجد، بے پانی کی بارش، مشمولہ بیزار آدم کے بیٹے، راولپنڈی، دستاویز پبلشر ۱۹۷۴ء

(۹) ایضاً: ص: ۱۵۳۔

(۱۰) سمیع آہوجہ، حُلیہ گم گشتہ، مشمولہ: ہم عصر اُردو افسانہ۔۱، کراچی، اکادمی بازیافت، جولائی ۲۰۰۶ء تا دسمبر ۲۰۰۲ء۔ ص: ۶۴۴۔

◁▷